انتظار حسین کا تنقیدی شعور اور روحِ عصر

ڈاکٹر محمد امجد عابد، شعبۂ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور
ڈاکٹر عاشق حسین ڈوگر، شعبۂ ایجوکیشن، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

Abstract

Intzar Hussain is renowed Novelist, Short story writer, Translator and critic. His criticism is fundamentally concerned with sociological and social matters. The criticism of Intzar Hussain shows that he was well aware of his era and ups and down of his era. He understood his contemporary environment. This article shows social aspect of his criticism.

انتظار حسین کی اصل پہچان افسانہ نگاری ہے تاہم انھوں نے ناول نگار، سوانح نگار، مترجم، سفر نامہ نگار، آپ بیتی نگار اور نقاد کے طور پر بھی شہرت حاصل کی انتظار حسین کی اِن تمام حیثیتوں میں سب سے وقیع اور اہم حیثیت ایک نقاد کی ہے۔ انھوں نے سوچ سمجھ کر یا کسی منصوبے کے تحت تنقید نہیں لکھی بلکہ ایسی ادبی معلومات نے انھیں لکھنے پر اکسایا جن پر وہ خاموش نہیں رہ سکے، خود اُن کا کہنا ہے کہ وہ ذاتی معاملات میں تو خاموش رہ سکتے ہیں لیکن ادبی معاملات میں چُپ نہیں رہ سکتے۔ چناں چہ انھوں نے جتنے بھی تنقیدی مضامین لکھے ہیں وہ ان کی اسی عادت کا نتیجہ ہیں۔ مختلف ادبی مسائل و معاملات اور صنفی موضوعات پر لکھے گئے مضامین دو کتابوں کی صورت میں دستیاب ہیں۔ ان کی پہلی تنقیدی کتاب ''علامتوں کا زوال'' ۱۹۸۲ء میں شایع ہوئی۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔ دوسری کتاب ''نظریے سے آگے'' ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی۔ اوّل الذکر کتاب میں کُل اٹھائیس مضامین شامل ہیں۔ جب کہ ثانی الذکر مجموعے میں کل چونتیس مضامین شامل ہیں۔

انتظار حسین کی ایک کتاب ''ملاقاتیں'' کے نام سے بھی شایع ہو چکی ہے۔ یہ کتاب اگرچہ معاصر ادیبوں اور شاعروں کے احوال اور تذکروں پر مشتمل ہے لیکن ان تحریروں میں بھی جستہ جستہ ان کی تنقید کے نقوش مل جاتے ہیں۔ جہاں وہ کسی ادیب یا شاعر کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے اس کی تخلیقات پر بھی اپنے مخصوص انداز میں قلم اٹھاتے ہیں۔ انتظار حسین اپنی تنقید میں دیگر نقادوں سے اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ انھوں نے مؤثر اور

جاذبِ نظر اسلوب میں تنقید لکھی ہے اور واقعات اور مثالوں سے اُسے دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا تخلیقی اور افسانوی اسلوب ان کی تنقید کی جان ہے۔ وہ اہم مسائل اور معاملات کو بھی چلتے چلتے واقعات اور لطائف میں بیان کر جاتے ہیں۔ مثلاً ان کا ایک مضمون ''اجتماعی تہذیب اور افسانہ'' ان کی کتاب ''علامتوں کا زوال'' میں شامل ہے۔ جس میں انھوں نے گزرے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس زمانے میں سماجی زندگی کے سارے مظاہر ہم رشتہ تھے یعنی سماجی زندگی کے مظاہر اور فطرت کے مظاہر اپنا جو مفہوم رکھتے تھے وہ آج کے تہذیبی مفہوم سے قطعی مختلف تھا۔ اس زمانے میں جاندار اور بے جان کے درمیان ابھی امتیازی حد قائم نہیں ہوئی تھی۔ درخت آدمی تھے اور سائے گھروں کے مکین سمجھے جاتے تھے۔ پتنگ کا کٹ جانا ایک واردات تھا اور گلہری کبھی دُم کھڑی کر کے سیٹی جیسی آواز میں چلاتی تھی تو ایک ہنگامہ پیدا ہوتا تھا۔ گل، پھول، شجر و حجر اور چرند و پرند ہمارے مذہب، تیوہاروں، میلوں ٹھیلوں، عشق کے معاملات اور جنگ و امن کے قصوں میں عمل دخل رکھتے تھے۔ بڑوں سے سنا کرتے تھے کہ رات کو درخت آرام کرتے ہیں اگر ان کو چھوا جائے گا تو ان کی نیند اچک ہو جائے گی اور وہ بے آرام ہوں گے۔ چڑیوں نے کمروں کے اندر چھتوں میں گھونسلے بنا کر کڑیوں کو قبل از وقت کھوکھلا کر دیا تھا اور چھتوں سے مٹی جھڑنے لگی تھی مگر کبھی کسی چڑیا کے گھونسلے کو نہیں اجاڑا گیا۔ بقول انتظار حسین:

> ''وہ دور انہی گلہریوں، پتنگوں اور درختوں کے ساتھ گزر گیا، اب ہم ستم زدگان کا جہاں اتنا تنگ ہے کہ آدمی اپنی جون میں مقید ہے، اس قید خانے سے اپنی مرضی سے باہر نکل سکتا ہے نہ کسی دوسرے کو اندر بلا سکتا ہے۔ اب ہم اعداد و شمار کی دنیا میں رہتے ہیں۔ چڑیوں کی حد بندیاں ہو گئی ہیں۔ ہمارے ارد گرد تہذیب کی سرحد کھنچ گئی ہے۔ ریڈیو اور اخبارات اس سرحد کے نگران ہیں۔ ان کا یہ کام ہے کہ کوئی بڑا افسانہ بنانے لگے تو تردیدی بیان شائع کر دیں۔''[۱]

یہ انتظار حسین کا تنقید لکھنے کا خاص انداز ہے۔ وہ ان مثالوں اور اسلوب سے اپنی بات اس طرح قاری کو سمجھانا چاہتے ہیں جیسے خود ان کی سمجھ میں آئی ہے۔ چناں چہ وہ تہذیب کی تبدیلی کے اس عمل کا افسانے پر اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تہذیبی زندگی کی سالمیت سلامت نہ رہے اور مربوط معاشرہ باقی نہ رہے تو اس کا اثر افسانے پر بھی پڑتا ہے۔ کیونکہ پھر افسانہ اجتماعی احساس کا حامل نہیں رہتا اور اسکی اپیل میں اتنی ہمہ گیری نہیں ہوتی کہ اسے مقبولِ عام کی سند حاصل ہو جائے جب تہذیبی سالمیت رخصت ہو چکی ہو تو اجتماعی احساس کا ترجمان بننے کے لیے افسانہ نگار کو بہت جتن کرنا پڑتے ہیں۔ اسے باطنی زندگی کی گہرائیوں میں یہ دریافت کرنا پڑتا ہے کہ وہ کون سے احساسات آدرش، تمنائیں اور موروثی شکلیں ہیں جو تہذیبی زندگی اور جذباتی چلن میں تفرقہ پڑ جانے کے باوجود مشترک ہیں اور سماج کے ایک فرد کا دوسرے فرد سے رشتہ جوڑتی ہیں۔ ان مشترکات میں ایک ماضی کا ورثہ ہوتا ہے جو یادوں کی صورت میں اجتماعی حافظے میں محفوظ ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا ماضی کو واپس لایا جائے مگر اُسے یاد تو رکھا جا سکتا ہے۔ ماضی سے اس کا ربط کسی ایک

اور سے نہیں پوری تاریخ سے رابطہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اس رابطہ کا منشا یہ ہوتا ہے کہ نئے احساس میں پشتوں کا تجربہ اور زمانوں کا شعور بھی شامل ہو۔ اسے وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''اگر پاکستان کا افسانہ نگار سن ستاون، معرکہ کربلا اور جنگ بدر سے اپنا رشتہ جوڑے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس قسم کا احساس تعمیر ہو رہا ہے۔ جس میں وہ ایک ہزار سالہ ہند اسلامی تہذیب کو اور پونے چودہ سو سالہ تاریخی شعور کو بھی شامل کرنے کے لیے کوشاں ہے اور یہ رشتہ وہ ہے جہاں ماضی حال اور مستقبل ایک مربوط برادری ہوتے ہیں۔''۲

انتظار حسین اپنی تنقید میں تمام ادوار اور زمانوں کو ایک مربوط اور منظّم شکل میں دیکھتے ہیں۔ اور ایک تخلیق کار کے لیے بھی ایسی بات کو لازم ٹھہراتے ہیں کہ اس کے یہاں نئے احساس میں ماضی کا ذائقہ بھی شامل ہونا چاہیے اور ماضی سے اس کا یہ رابطہ دراصل پوری تاریخ سے رابطہ ہے جو اپنے سارے تجربات اسے منتقل کرتی ہے۔ ''علامتوں کا زوال'' کا ایک دوسرا مضمون ''نیا ادب اور پرانی کہانیاں'' بھی یہی طرز احساس لیے ہوئے ہے۔ اس مضمون میں ان کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ایک تخلیق کار کے یہاں ایک وقت میں کئی صدیاں سانس لیتی ہیں۔ اس ادراک کے باعث احساسات کے قدیم سانچے اور اظہار کی پرانی صورتیں، جو متروک ہو جاتی ہیں، نئے سرے سے بامعنی اور کارآمد نظر آنے لگتی ہیں۔ انتظار حسین اپنی تنقید میں بات سمجھانے کے لیے مثالوں سے کام لیتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''فسادات کے دنوں میں ہماری بستی کی چڑیوں نے یکا یک صبح کو چہکنا بند کر دیا تھا۔ کہتے ہیں کوئی آفت آنے والی ہو تو چڑیا پہلے سے سونگھ لیتی ہیں اور ان شاخوں سے ہجرت کر جاتی ہیں۔ غالبؔ کا وجدان چڑیوں سے کم تیز نہیں تھا۔ غالب کا دور سن ستاون کی آفت کے ساتھ ختم ہوا۔ مگر اس نے غزل کہنی کئی برس پہلے سے چھوڑ رکھی تھی۔ پھر اس نے یاروں کو اُردو میں خط لکھنے کا شغل پکڑا۔ سن ستاون میں یہی شغل اس کے لیے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بن گیا۔''۳

''علامتوں کا زوال''، مضمون میں وہ گم ہوتی ہوئی علامتوں کو پھر سے شعور کا حصہ بنانے اور بکھرتے سانچوں کو پھر سے منظّم دیکھنے کی خواہش کو حسرت تعمیر سے تعبیر کرتے ہیں۔ انتظار حسین کے خیال میں یہ احساس اور حسرت اپنی ماہیت کے اعتبار سے ان تحریکوں کے خلاف بھی ایک ردعمل ہے جو زوال کے اس عمل کی مظہر تھیں اور جنھوں نے اس عمل کو تیز کیا۔ لکھتے ہیں:

> ''یہ کیا افتاد پڑی کہ غزل سے قیس و فرہاد ہجرت کر گئے اور کوہ طور پر ایسی بجلی گری کہ غزل میں اب اس کا نشان نہیں ملتا۔ قیس و فرہاد کے استعاروں کے مر جانے کے معنی یہ ہیں کہ ایک بنیادی انسانی جذبہ ہمارے معاشرے میں ایک پیہم تہذیبی اثر کے ماتحت جس سانچہ میں ڈھل گیا تھا وہ سانچہ بکھر گیا ہے۔ جب ایسا سانچہ بکھرتا ہے تو اخباروں میں اغوا اور قتل کی خبروں اور رسالوں میں رومانی نظموں اور افسانوں کی بہتات ہو جاتی ہے۔ رومانی شاعری اور

رومانی افسانہ جذبات کے اغوا اور قتل کی وارداتیں ہیں۔''[۴]

اپنے ایک مضمون ''رسم الخط اور پھول'' میں وہ رسم الخط کے مسئلے کو پھولوں کے مسئلے کا حصہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ ہمیں اپنے پھول عزیز نہیں رہے ہیں، رسم الخط کا مسئلہ پھولوں کے مسئلہ کا حصہ ہے۔ جب باغیچوں سے ان کے اپنے پھول رخصت ہو جائیں اور پرانے پھول کھلنے لگیں تو یہ وقت اس زمین کی پوری تہذیب پر بھاری ہوتا ہے۔ رسم الخط اپنی جگہ کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ تہذیب کا حصہ ہوتا ہے۔ یہ تہذیب شکلوں کے ایک سلسلہ کو جنم دیتی ہے یا پہلے سے موجود شکلوں کو ایک نئی معنویت دے دیتی ہے۔ بہر حال تہذیبی زندگی شکلوں کا ایک نظام ہوتا ہے۔ ممکن ہے بظاہر نظر نہ آئے مگر ان کی تہہ میں ایک وحدت موجود ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ سب شکلیں ایک دوسرے سے پیوست ہوتی ہیں۔ ان میں سے اگر کوئی ایک شکل نکل جائے اور اس کی جگہ کوئی اجنبی شکل لا کر رکھ دی جائے تو اس سے شکلوں کے اس پورے نظام میں درہمی پیدا ہوتی ہے اور ان کی بنیادی وحدت کو صدمہ پہنچتا ہے۔ فارسی رسم الخط ہماری تہذیب کی وہ شکل ہے جو اس کی بنیادی وحدت کے نشان کا مرتبہ رکھتا ہے..... اگر یہ نشان گر گیا تو تہذیب کی باقی شکلیں کتنے دن کی مہمان ہیں۔ پس مسئلہ محض اس رسم الخط کا نہیں بلکہ اس پوری تہذیب کا ہے جس کا یہ رسم الخط نشان ہے۔''[۵]

یہ مضمون اس امکانی منصوبے کے ردّ میں لکھا گیا جس میں یہ تجویز تھی کہ اُردو زبان کو عالمی سطح پر وسعت دینے کے لیے اس کا رسم الخط تبدیل کر کے رومن اختیار کیا جائے جس میں انگریزی حروف تہجی میں ادائے مطلب ترتیب دیا جائے۔ انتظار حسین رسم الخط کو تہذیب کا حصہ قرار دیتے ہیں اور اس امر پر یہ نقطہ نظر رکھتے ہیں کہ اُردو زبان کے لیے فارسی رسم الخط ترک کر کے رومن رسم الخط اختیار کرنے کا مطلب دراصل ہماری تہذیب کا زوال اور تہذیبی اقدار کا انہدام ہے۔

''یوں سمجھیے کہ ہم رومن رسم الخط کی پُلی لگا کر گری ہوئی اُردو کو کھڑا کرنا چاہتے ہیں اور اس پلی کے سہارے نئے سائنسی علوم کے آسمان کو چھونا چاہتے ہیں۔ یوں اگر رسم الخط کی بلی کے سہارے پروفیسر انجم رومانی آئن سٹائن بن جائیں اور ن۔م۔راشد ٹی ایس ایلیٹ کے برابر کھڑے ہوسکیں تو اس میں بے شک اُردو کی بڑی عزت ہے۔ لیکن کہیں یہ نہ ہو کہ اس چکر میں پروفیسر انجم رومانی ٹوٹی پھوٹی غزل کہنے سے بھی جائیں اور راشد صاحب کو جو چار بھلے آدمی اب پڑھ لیتے ہیں وہ بھی انہیں طاق میں بٹھا دیں اور اُردو بے چاری دھوبی کا کتا بن کر رہ جائے۔''[۶]

انتظار حسین یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ انگریزی پھول اور رومن حروف اجنبی زمینوں سے آئے ہیں۔ ہمیں ان سے مہک نہیں آتی۔ ہماری باطنی زندگی میں انہیں کبھی وہ رسوخ حاصل نہیں ہوسکتا جس کے بعد پھول اور حروف روحانی معنویت کے حامل بن جایا کرتے ہیں۔ انتظار کی تنقید کے موضوعات میں خاصی

وسعت پائی جاتی ہے۔ ''ادب اور معاشرہ'' بھی ان کی تنقیدی قلم رو میں شامل ہے۔ یہاں انھیں یہ شکوہ ہے کہ جو معاشرہ اپنے آپ کو نہیں جانتا وہ ادیب کو کیسے جانے گا۔ جنھیں اپنے ضمیر کی آواز سنائی نہیں دیتی انھیں ادیب کی آواز کیسے سُنائی دے گی۔ ڈرامے میں قومی موضوعات کے حوالے سے ان کا موقف ہے کہ قومی ڈرامہ اسے کہیں گے جس میں لکھنے والے کو قوم کی روح تک رسائی حاصل ہو اور جس میں یہاں کا آدمی اپنے آپ کو اپنے باطن کی تمام گہرائیوں سمیت محسوس کر سکے۔ ادب اور تصوف کے حوالے سے ان کی یہ سطور ملاحظہ ہوں:

> ''اصل میں ہمارے یہاں شعر اور افسانہ زندہ ہی اس وجہ سے ہیں کہ شاہ رکن الدین عالم کے مزار کے گنبد پر کبوتر بیٹھے ہیں اور اندر موم بتیوں کے دھندلکے میں کوئی عورت اپنی مراد مانگ رہی ہے اور باہر ایک سائیں دوتارہ بجا رہا ہے اور کافیاں پڑھ رہا ہے۔ یہ سلسلہ ختم ہو جائے تو شعر اور افسانہ ختم ہو جائیں گے۔ بس فاضل پروفیسروں کی تنقید رہ جائے گی۔'' ۷

مجموعی طور پر ادبی صورت حال پر قلم اٹھانے کے ساتھ ساتھ انتظار حسین نے ادبی شخصیات اور شاعروں کو بھی اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے۔ ان میں میرا جی، قرۃ العین حیدر، انیس، امیر خسرو، احمد مشتاق، غالب احمد، کشور ناہید، زاہد ڈار، خالدہ حسین وغیرہ شامل ہیں۔

انتظار حسین کی تنقید پر دوسری کتاب ''نظریے سے آگے'' امیر خسرو، انشا اللہ خاں انشا اور میر انیس جیسے شاعروں سمیت بعض اہم اور نظری موضوعات کو بیان کرتی ہے۔ اس کتاب کا نام انتظار حسین کے اس خطبے کی رعایت سے رکھا گیا ہے جو انھوں نے حلقہ اربابِ ذوق کے سالانہ اجلاس میں پیش کیا تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہمیں نظریے میں آگے بڑھ کر دیکھنا چاہیے۔ کیونکہ جب بھی کوئی نیا نظریہ پیدا ہوتا ہے تو فکر و احساس کی آزادی کے لیے ایک نیا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ فکر و احساس کی آزادی کو کچلنے کے لیے نظریے سے زیادہ موثر ہتھیار کوئی نہیں ہے۔ اسی طرح معاشرے اور ادیب کے تعلق کے ضمن میں ان کا کہنا ہے کہ معاشرے سے ادیب کا بہت زیادہ رشتے بڑھا لینا بھی کوئی خوبی کی بات نہیں۔ پھر ایسے معاشرے سے جس کی کوئی کل سیدھی نہ ہو، تعلق بڑھا لینا کئی خرابیوں کا باعث بن سکتا ہے۔

انتظار حسین اپنی تہذیب اور ثقافت پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تہذیبیں لین دین کر کے پھلتی پھولتی ہیں۔ اگر کسی تہذیب کے لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہمارے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں ہے بس ہم لے ہی سکتے ہیں تو یہ احساس، احساسِ کمتری کو جنم دیتا ہے۔ ہم اپنی تہذیب میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں چاہتے۔ ہمیں اپنی تہذیب میں کہیں عجمی سازش نظر آتی ہے تو کہیں ہندوانہ رنگ دکھائی دے جاتا ہے جو ہماری غیرت کو گوارا نہیں ہوتا۔ بقول انتظار حسین:

> ''عجیب بات ہے کہ ثقافت میں ملاوٹ پر ہمیں اس قدر تشویش ہے۔ مگر غذاؤں میں جو ملاوٹ ہو رہی ہے اس کی کوئی فکر نہیں۔ اصل میں ملاوٹ پر فکر ہمیں غلط جگہ ہو رہی ہے۔ فکر

ہمیں اس اس پر ہونی چاہیے کہ غذاؤں میں ملاوٹ سے صحت عامہ تباہ ہو رہی ہے۔ تہذیب کا کیا ہے اس میں ملاوٹ تو ہوتی رہتی ہے، ہوتی رہنی چاہیے۔''۸

انتظار حسین کا موقف یہ ہے کہ تہذیب میں ملاوٹ کا ہونا تو لازمی امر ہے۔ یہ صرف اسی صورت میں نہیں ہو سکتی کہ جب کوئی قوم الگ تھلگ کسی جزیرے میں بند ہو کر بیٹھ جائے اور اپنی سرحدوں سے باہر قدم ہی نہ نکالے تو شائد وہ کسی خاص تہذیب کے تصور کو اپنا سکے۔ تہذیب میں ملاوٹ کا تو نا تو اکثر رویا جاتا ہے مگر چیزوں میں ملاوٹ جو ہماری نسل کو برباد کر رہی ہے اس کی فکر کسی کو بھی نہیں ہے۔

انتظار حسین نے اپنی تنقید کے لیے جو اصول وضع کیے ہیں ان کی بنیاد راستی اور صاف گوئی پر استوار ہے۔ انھوں نے اپنی تنقید میں ہر حوالے سے ادبی جہتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے اور گہرا عصری شعور رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی حوالوں کو بھی اپنی تنقید میں بے حد اہمیت دیتے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ انتظار حسین، علامتوں کا زوال، (لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۰

۲۔ ایضاً، ص ۲۲

۳۔ ایضاً، ص ۲۶

۴۔ ایضاً، ص ۵۶

۵۔ ایضاً، ص ۶۰

۶۔ ایضاً، ص ۶۱

۷۔ ایضاً، ص ۹۱

۸۔ انتظار حسین، قومی تشخص اور ثقافت، مضمون مشمولہ: کلچر، مرتبہ: اشتیاق احمد، (لاہور، بیت الحکمت، ۲۰۰۷ء)، ص ۳۵۲، ۳۵۳

مآخذ:

۱۔ حسین، انتظار، علامتوں کا زوال، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء۔

۲۔ حسین، انتظار، قومی تشخص اور ثقافت، مضمون مشمولہ: کلچر، مرتبہ: اشتیاق احمد، لاہور، بیت الحکمت، ۲۰۰۷ء۔

☆☆☆